Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتا ہے جب اس کے رومانس کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اور ہر اس چیز کی طرح، جو اپنے آپ کو دہراتی ہے، گول ہوتی ہے۔" اس نے کہا، "چاند، سورج، تارے، زمین، آسمان، پیڑ، پودے، لہو ــــ"

"لہو؟" بچے نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا، "یہ سر کے بالوں سے پیر کے ناخنوں کو جاتا ہے اور پیر کے ناخنوں سے سر کے بالوں کو اور پھر پیر کے ناخنوں کو اور اس طرح بدن کے لامقام سفر میں چکر کاٹتا ہے، گول۔ گول۔ گول ــــ" وہ ہنسا۔

مگر اب بچہ سنجیدگی سے دلچسپی لے رہا تھا۔ "بابا ــــ" اس نے پوچھا، "آدمی بھی گول ہوتے ہیں؟"

وہ حیران رہ گیا۔ منطقی طور پہ اگلا سوال یہی ہو سکتا تھا۔ مگر عام لوگوں کی طرح وہ بھی اس غیر منطقی رویے کا شکار تھا جو بہت سی ہونے والی باتوں کے بارے میں انہیں خوش فہم بنائے رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ سوال سُن کر حیران رہ گیا۔

"ہاں۔" اُس نے کہا، "سویرے سے شام کرتے ہیں اور شام سے سویرا اور اپنی عادت کے اس چکر میں لگاتار گھومتے ہیں، لگاتار۔ چنانچہ گول ہوتے ہیں۔"

بچہ بے یقینی سے ہنسا۔

"اسی چکر کو توڑنا فن ہے۔" اس نے بات ختم کی۔

اب وہ ایک ایسے کھیت میں سے گزر رہے تھے جہاں سے گنے کی فصل ماگھ میں کاٹی جا چکی تھی۔ اس کھیت کی خشک مٹی پپڑیوں اور ڈھیلوں میں جمی ہوئی تھی۔ کمزور سفید زمین جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی اور ناہموار تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور گنے کی خشک جڑیں جگہ جگہ سے اُبھری ہوئی تھیں اور ان میں مٹیالے رنگ کے کیڑے مکوڑے چل رہے تھے۔ گنے کی جھڑی ہوئی چھال کے زرد ٹکڑے نیم گرم بگولوں میں ہلکا ہلکا شور کرتے ہوئے اُڑ رہے تھے بھوسلی چڑیوں کی ایک ڈار اُن کے سروں سے شاں کر کے گزری۔

"اس کھیت میں اب تک ہل چل جانا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

"پھر کیوں نہیں چلا؟" بچے نے پوچھا۔

"گنے کی جڑیں دوبارہ پھوٹ پڑتی ہیں۔" اس نے کہا، "پر فصل آدھی بھی نہیں اُترتی۔ کام سے جی چرانے والے کسان اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔"

"بابا!" بچے نے کہا، "کسان تو کام سے جی نہیں چراتے۔"

"کسان بھی عام آدمیوں کی طرح آدمی ہوتے ہیں بیٹے۔" اس نے کہا، "چنانچہ گول ہوتے ہیں۔" بچہ بے یقینی سے ہنسا اور پگڈنڈی پر بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔ آگے ایک سہاگہ پھیر کر تیار کیا ہوا کھیت تھا۔ اس نے بچے کو دوڑ کے زور میں چند قدم کھیت کے اندر جاتے اور اس کے پاؤں کو جوتوں سمیت نرم زمین میں اُترتے ہوئے دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ بچپن میں اسے بھی سہاگہ پھیرے ہموار کھیت میں ننگے پاؤں بھاگنا (جب پاؤں ٹخنوں سے اُوپر اُوپر تک روئی کی سی نرم اور بھربھری مٹی میں ہوا کی طرح دھنس جاتے تھے اور اندر تلووں کو کھیت کی دبی ہوئی نمی کی مخصوص ٹھنڈک اور حدّت بیک وقت جادو کی طرح چڑھتی تھی) بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس نے پگڈنڈی پر رک کر، آنکھیں سکیڑ کر کھیت کی چمچماتی ہوئی سیدھی سطح پر نظر ڈالی اور اس کی طاقت ور سیاہ، سیراب مٹی کی قدیم، مانوس بو کو سونگھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

"اس کھیت کا کسان محنتی ہے۔" اس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بابا!" بچے نے شرارت سے پوچھا، "گول بھی ہے؟"

"ٹھہرو ــــ" اس نے نعرہ لگایا اور بیٹے کے پیچھے دوڑ پڑا۔

تنگ پگڈنڈیوں پر آگے پیچھے دوڑتے اور ہنستے ہوئے وہ کئی کھیتوں میں سے گزرے۔ اس کا بیٹا اس سے کہیں ہلکا اور پاؤں کا پکا تھا۔ وہ خرگوش کی سی پھرتی اور آسانی سے اس کے آگے آگے بھاگ رہا تھا جب کہ خود اس کا پاؤں کئی بار پگڈنڈی سے پھسل کر ادھر اُدھر گیلے اور خشک کھیتوں میں پڑ چکا تھا اور کیچڑ اور مٹی سے لتھڑ گیا تھا۔ جب ایک پگڈنڈی ختم ہو جاتی اور دوسری اسے زاویۂ قائمہ پر کاٹتی ہوئی ملتی تو بچہ رک جاتا اور ایک لحظے تک فیصلہ نہ کر سکتا کہ دائیں کو مڑے یا بائیں کو۔ پھر وہ مڑ کر دیکھتا اور اپنے باپ کو تیزی سے بڑھتے ہوئے پا کر اندھا دھند ایک طرف کو مڑ جاتا اور بھاگنے لگتا۔ مگر اسی ایک لحظے میں اس کا باپ درمیانی فاصلے کو چند قدم کم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اب وہ ایک نسبتاً چوڑی اور سیدھی پگڈنڈی پر ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس پگڈنڈی کے دونوں جانب گیہوں کی فصل کھڑی تھی جسے شاید آخری پانی لگایا جا رہا تھا۔ ان کے قدموں کی دھمک سے ڈر کر دو خرگوش اور ایک خبگلی بلا ایک طرف سے نمودار ہوئے اور ان کے رستے کو پھلانگ کر دوسری طرف فصل میں غائب ہو گئے۔ ایک کھیت سے ننھی خاکستری چڑیوں کی ڈار اُڑی اور فصل کے اُوپر اُوپر تیرنے لگی۔ ایک طرف کی بالیوں میں چلتی ہوئی ہوا اس کے چہرے کو چھوتی، بال اُڑاتی، اس کا لہو اُچھالتی ہوئی دوسری طرف کی بالیوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے صرف ایک قدم پیچھے تھا اور ہاتھ پھیلا کر تیزی سے قریب ہوتا اور بچے کے نرم اور گرم اور تڑپتے پھسلتے پیارے بدن کو قابو میں کرنے کے لیے بے تاب ہوا جا رہا تھا کہ دفعتاً پگڈنڈی ختم ہو گئی۔ آگے ایک کنواں تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی پگڈنڈی پر اسی موسم میں وہ سات سال کا تھا ——— اس نے یاد کیا — اور اپنے باپ کے آگے آگے دوڑ رہا تھا کہ پگڈنڈی ختم ہو گئی تھی اور وہ کنوئیں کے پانی کی نالی پھلانگ کر آگے نکل گیا تھا اور اس کا باپ، کہ ہر قسم کی چھلانگ لگانے سے گھبراتا تھا، وہیں رُک گیا تھا اور مڑ کر ہوا میں جھوٹ موٹ غور سے دیکھنے لگا تھا جیسے اس کی کوئی بیش قیمت چیز پیچھے رہ گئی ہو۔ یہی زمین تھی اور یہی فصل تھی اور یہی پانی اور بالیوں میں سرسراتی ہوئی تازہ نیم جوش ہوا تھی اور خاکستری رنگ کی ننھی ننھی چڑیوں کی ڈار فصلوں کے اُوپر اُوپر تیرتی تھی اور باپ اور بیٹا تعاقب میں تھے۔ اس نے یاد کیا — باپ اور بیٹا اور زمین اور باپ اور بیٹا! واقعات کیسے اپنے چکر کو پورا کرتے تھے اور کیسے اختصار اور ضابطے اور نونانسنس کے ساتھ جیسے گھڑی کی سوئیاں! وہ حیران رہ گیا۔

پھر وہ گھٹنا ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور بہتے ہوئے شفاف پانی میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ کو دیکھا اور انگلیوں کی پوروں پر اس ٹھنڈک اور حدت کو بیک وقت محسوس کیا جو گہری مٹی اور بہتے ہوئے پانی اور انسانی بدن کی پُراسرار خاصیت ہوتی ہے اور جو اس وقت سے تھی جب وہ سات برس کا تھا، اور اس نے گیلی خنک مٹی اور ادھ پکی فصل کی بے نام خوشبو کو سونگھا جو وہیں کی وہیں قائم تھی — اب بھی جب وہ پینتیس برس کا ہو چکا تھا، اور اس پر زندگی کے اس خوفناک، منشی اور لامقام جادو کے چکر کا انکشاف ہوا اور اس نے سوچا: صرف پانی لہو میں بدل جاتا ہے اور زمین کے رشتے نسل سے نسل کو منتقل ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ سرگرداں رہتا ہے —

باپ سے بیٹے کو، باپ سے بیٹے کو!

پانی میں تیرتے ہوئے سفید لمبی لمبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس کنوئیں کی پشت پر، جہاں سے یہ پگڈنڈی دوبارہ شروع ہوتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی، ایک بخوی بیٹھا کرتا تھا جس کے آگے ایک میلا سا کپڑا پھیلا ہوتا تھا جس پر عجیب وغریب قسم کے سکے اور پیتل کے چھوٹے چھوٹے منبروں والے مکعب بکھرے رہتے تھے۔ اس نے پانی سے ہاتھ نکال کر چہرے پہ پھیرا اور پھر بالوں سے پونچھ کر خشک کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کنواں ریں ریں کی مدھم، یکساں، خواب آلود آواز نکالتا ہوا چل رہا تھا اور اس کا بیٹا اُچک کر گادی پہ سوار ہو بیٹھا تھا اور ایک کھوپے چڑھے بیل کی دم پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ دائیں طرف جامن اور شہتوت کے پیڑوں کا جھنڈ تھا جس میں کاشت کار کا کچا مکان تھا۔ کاشت کار اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ٹوکے سے چارہ کتر رہا تھا۔ مکان کی دیوار کے ساتھ کھرلی پر بھینس بندھی تھی جس کی پشت پہ ایک کوا بیٹھا چونچ مار رہا تھا۔ اس سایہ دار، خاموش اور پُرامن منظر کو آنکھوں میں اُتار کر اُس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈیرے کی پشت پہ جا نکلا۔ جوتشی کی جگہ خالی تھی۔

اس کے پیچھے کنوئیں کے چلنے اور پانی کے بہنے اور کسان کے ٹوکے کی آواز تھی اور گہری سایہ دار جگہوں میں گرے ہوئے پرانے پتوں کی تیز بُو تھی اور سامنے چلچلاتے ہوئے رنگ تھے اور گیہوں کی لاکھوں جھومتی ہوئی بالیوں کی سرسراہٹ تھی۔ ساری جگہوں میں سے جوتشی نے صرف اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ اس نے سوچا۔ حالانکہ یہاں سے صرف پیدل دہقان گزرا کرتے تھے اور اس نے کبھی کسی دہقان کو جوتشی کے پاس بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی ہی پراسرار بات تھی جیسی بچپن کی ساری سرزمین ہوتی ہے۔ اس نے سوچا، اور جوتشی جب تک وہاں رہا تھا ہمیشہ بڑے اطمینان اور فراغت سے وہاں بیٹھا ہوا ملتا رہا تھا۔ اس کے پاس پرانی سی سیاہ صندوقچی پڑی رہتی تھی جس پر چند بوسیدہ کتابیں اُوپر نیچے رکھی ہوتی تھیں جن کے ساتھ ایک چوکور گتا کھڑا ہوتا تھا جس پر انسانی ہاتھ کی شکل بنی ہوئی تھی اور ہتھیلی میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چند لکیریں کھچی تھیں اور نیچے بڑے بڑے لفظوں میں لکھا تھا: جوتش۔ رمل۔ نجوم۔ ابجد۔

"ابجد؟" ایک روز اس نے اپنے باپ سے پوچھا تھا، "یہ کیا ہوتا ہے بابا!" اور اس کا باپ کہ اور ساری باتوں کے علاوہ ابجد کا بھی علم رکھتا تھا (اس کے باپ کی بڑی بڑی ڈھلکی ہوئی شفیق مونچھیں تھیں اور وہ دنیا کے سارے علموں کا ماہر تھا۔) بولا تھا: "اسموں کا علم ہوتا ہے بیٹے۔"

"اسموں کا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں ــــ" اس کے باپ نے کہا تھا، "ناموں کا۔"

"ناموں کا کیسے بابا؟"

"ہر شخص کے نام کا اثر اس کی ساری زندگی پر پڑتا ہے بیٹے اسے ابجد کہتے ہیں۔"

"نام کا اثر کیسے پڑتا ہے بابا؟" اس نے پوچھا تھا، اور اس کا باپ آرام سے پگڈنڈی پر بندوق کو گود میں رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور اسے پاس بٹھا کر بولا تھا:

"یہ لفظوں کا علم ہے بیٹے۔ اور لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے۔"

"جادو ہوتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"ایسے ــــ" اس کا باپ ایک بالی توڑ کر اسے دانتوں میں چباتے ہوئے بولا تھا، "کہ جیسے تمہارا نام ہے جسے سویرے سے شام تک میں اور تمہاری ماں اور بہن اور سکول میں تمہارے استاد اور ہم جماعت ان گنت بار پکارتے ہیں اور تم اس نام پہ بولتے ہو۔ مگر نام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ نام جتنی بار بھی پکارا جاتا ہے اس کا ایک لفظ بنتا ہے اور منہ سے نکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر ہوا میں جاتا ہے کہ اس کی ایک شکل ہوتی ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ضایع ہو گیا مگر کبھی ضایع نہیں ہوتا کیونکہ لفظ زندہ ہوتا ہے اور اس کا رشتہ تمہارے ستارے سے ہوتا ہے، اور ہر بار جو پکارا جاتا ہے تو آواز کی رفتار سے اُڑتا ہے اور آٹو میٹک (بابا کو یہ لفظ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ دل میں ہنسا۔) سیدھا تمہارے ستارے تک پہنچتا ہے اور اس سے جا ٹکراتا ہے، ہر بار، اور یوں تمہاری زندگی پہ اثر انداز ہوتا ہے۔"

"ستارہ کیا ہوتا ہے بابا؟"

"ہر شخص کا ایک ستارہ ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر وہ پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور مرتا بھی ہے۔"

دونوں اٹھ کر پھر آگے پیچھے پگڈنڈی پر چل پڑے تھے، اور جب کچھ دیر بعد اور باتیں کرتے ہوئے، اس کے باپ نے کہا تھا: "اب دو چار برس میں تمہیں نپولین کی سوانح عمری پڑھ لینی چاہیے" تو اسے وہ پھیکے سُرخ رنگ کی جلد والی، خستہ بھورے کاغذ اور باریک سہ کالمی لکھائی کے صفحوں والی موٹی سی کتاب یاد آگئی تھی جو ہر وقت اس کے باپ کی کرسی کے پاس تپائی پر پڑی رہتی تھی اور جسے اس کا باپ موقع بموقع اُٹھا کر پڑھتا اور حاشیوں پر کچھ لکھتا رہتا تھا اور جس سے پرانے کاغذ کی مخصوص تیز بُو آیا کرتی تھی — اس کو وہ کتاب، جس سے وہ ایسے ہی مانوس تھا جیسے اپنے جوتے یا اپنے بستر سے، یاد آگئی تھی۔ اس نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا: "بابا! میں بھی بڑا ہو کر کتابیں لکھوں گا۔" اور اس کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے باپ نے آنکھیں پھیلا کر، تقریباً اُداسی سے، اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر پگڈنڈی پر بندوق کو گود میں رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کو پاس بٹھا کر بولا تھا:

"لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے بیٹے۔" اس نے کہا تھا، "مگر لفظ لکھنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا مشکل کام ہے۔"

"مشکل کیسے ہے بابا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ایسے ــــ" اس کا باپ آنکھیں سکیڑ کر آسمان پر دیکھتا ہوا بولا تھا، "کہ جیسے یہ بادل۔"

"بادل؟"

"ہاں۔" اس کے باپ نے کہا تھا، "یہ بدلیاں دیکھ رہے ہو؟ پچھلے ایک گھنٹے سے کیسی دھلی دھلائی دھنکی ہوئی اور پریس کی ہوئی روئی کی ٹھوس چٹانوں کی طرح آسمان میں سر اٹھائے کھڑی ہیں اور نہ ہلتی ہیں نہ جلتی ہیں نہ شکل بدلتی ہیں۔ دیکھا تم نے؟"

"ہاں بابا۔"

"دیکھا تم نے کہ ان کی ایک ایک نوک اور ایک ایک قوس اور ایک ایک لکیر جیسے پتھر سے کاٹ کر بنائی گئی ہے؟"

"ہاں بابا۔"

"اور اپنے اختصار اور اپنی خاموشی کے باوجود ان میں اتنی تندی اور اتنا تشدد اور اتنی زندگی اور قوت ہے کہ دل پر نقش ہو جاتی ہیں اور ایک بار دیکھ لو تو سارا سال نہیں بھولتیں؟" اس کی آنکھیں یکبارگی چمک اُٹھی تھیں، "دیکھا تم نے؟"

"ہاں بابا۔"

"مگر ــــ" اس کی آنکھوں کی چمک یکبارگی غائب ہو گئی تھی اور وہ ایک بالی توڑ کر اداسی سے اُسے سونگھتے ہوئے بولا تھا، "یہ بدلیاں صرف بہار کے بہار آتی ہیں، چند روز کے لیے بس۔ پھر سارا سال وہی میلے میلے مٹیالے، غیر معین اور غیر واضح اور مکڑی کے جالے کے سے بدرنگ بادلوں کا چکر چلتا ہے جو آتے ہیں اور گرجتے ہیں اور دھوپ ــ" وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالی کھیت میں پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اور دھوپ کے آنکھوں میں کھب جانے والے رنگوں کو ختم کر دیتے ہیں۔"

وہ پھر پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلنے لگے تھے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اس نے اس کی پروا بھی نہ کی تھی اور بھلا دیا تھا، اس لیے کہ کتابیں لکھنے کی بات اس نے بے سوچے سمجھے، بالکل سرسری طور پر کی تھی اور اصل میں اس کا مطلب یہ نہ تھا۔ مگر بعد میں — بہت بعد میں — جب وہ واقعی بڑا ہو گیا اور اس نے کتابیں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اپنے باپ کی کہی ہوئی بات اپنے سارے معنی کے ساتھ بڑے واضح طور پر اس کے سامنے آ گئی، اس لیے کہ جب کبھی وہ کسی خیال کے جادو کو محسوس کر کے چونک کر اُٹھا اور قلم اُٹھا کر کاغذ پر جھکا تو خیال کو لفظ میں منتقل کرتے کرتے اس کا سارا جادو غائب ہو گیا اور اس نے اپنے آگے کاغذ پر کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے بے جان، بے اثر لفظوں کو بدمزگی سے دیکھا اور سکتے میں آ گیا، اور پھر اس نے سر اٹھا کر بہار کی ان بدلیوں کو تلاش کیا جن کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اور ہمیشہ اس نے حیران ہو کر سوچا کہ اس کا باپ، جس نے کبھی ایک کتاب بھی نہ لکھی تھی، کیسے ان سب باتوں کا علم رکھتا تھا!

وہ بدلیاں کبھی نہ آئی تھیں۔ وہ لفظ کبھی اس کو نہ ملا جس کی تلاش میں وہ تھا — وہ کاٹا چھانٹا ہوا، دھلا دھلایا ہوا، صاف ستھرا، مختصر اور تند اور قوی، ٹھوس دھات کا گھڑا ہوا لفظ جس پہ نظر ڈالو تو سانس لے اور زبان پہ لاؤ تو جی اُٹھے اور دل کی طرح دھڑکے۔ وہ لفظ صرف اس کے خیال میں جادو جگاتا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ علم رہا تھا کہ لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے، مگر اس بات کا اسے پتا چلا تھا کہ لفظ لکھنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا کٹھن کام ہے۔ اس نے ہزاروں کیڑے مکوڑے پھیلائے اور مشہور بھی ہوا مگر دوسرے بڑے بڑے اور مشہور کتابیں لکھنے والوں کی طرح ہمیشہ ناکام رہا تھا۔

"بابا۔" اس کا بیٹا اس کی ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا کر رہے ہیں؟"

"سوچ رہا ہوں بیٹے۔"

"کیا سوچ رہے ہیں بابا؟"

"کیا سوچ رہا ہوں؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر فضل کے اوپر اوپر دیکھتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا۔ "کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں؟" بچے نے دہرایا۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھ جاؤ بیٹے۔" اس نے کہا۔ پھر اس نے ایک ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنی اٹھا کر اس سے سفیدہ بھرے ہوئے کھیت کی سطح پر ایک گول دائرہ کھینچا۔ "میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔" اس نے کہا، "یہ دائرہ آدمی کا بنیادی رویہ ہے۔ اور اسی دائرے میں آدمی کی ساری سوچ بند ہے۔ اس دائرے سے باہر نامعلوم کی دنیا ہے، اندھیرا ہے۔" پھر اس نے دائرے کے محیط پر قریب قریب دو نشان لگائے۔ "ان نشانوں کے درمیان یہ مختصر سا علاقہ بھلائی کا علاقہ ہے۔ یہاں سے پھر ــــ" اس نے دائیں طرف محیط کے ساتھ ساتھ لکڑی گھمائی، "ظلم شروع ہوتا ہے اور یہاں سے ــــ" اس نے بائیں طرف لکڑی گھمائی، "منفی اچھائی شروع ہوتی ہے۔ ان تینوں علاقوں کی آپس کی حدیں بڑی باریک اور تقریباً بے معلوم ہوتی ہیں، اتنی کہ یہاں سے دیکھنے پر سب آپس میں گڈمڈ ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے: آدمی کا بنیادی رویہ۔ بھلائی ہو، برائی ہو یا ظلم ہو، آدمی کا بنیادی رویہ جارحانہ ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ہم سوچتے بھی ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو کچھ نہیں سوچتے۔"

"کچھ بھی نہیں؟" بچے نے دہرایا۔

"ہاں۔ جب تک آدمی کا بنیادی رویہ بدل نہیں پاتا تب تک یہ دائرہ نہیں ٹوٹتا اور تب تک اس سے باہر کے نامعلوم علاقے میں ہماری رسائی نہیں ہوتی جو بہت بڑا علاقہ ہے اور اس دائرے کی جس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں اور جہاں زندگی کی اصل نسل باتوں کا علم رہتا ہے۔ سمجھے؟"

بچہ بے یقینی سے ہنسا۔

وہ ٹوٹی ہوئی ٹہنی پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بیٹے کی گردن میں بازو ڈالا اور وہ واپس شہر کو مڑے۔ اسے پتا تھا کہ بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، مگر وہ یہ سوچ کر طمانیت سے دل میں مسکرایا کہ عمر میں کبھی نہ کبھی وہ ضرور، کہیں نہ کہیں، ان باتوں کے روبرو آ کھڑا ہوگا اور سمجھ جائے گا اور پھر وہ اپنے باپ کو یاد کرے گا۔

واپسی پر اب وہ دوسرے راستے پر، دوسری پگڈنڈیوں پر چل رہے تھے جو بہرحال سڑک پہ اُسی جگہ جا کر نکلتی تھیں جہاں سے انھوں نے کھیتوں میں قدم رکھا تھا۔ بچہ اب اس کے بازو کے حلقے سے نکل کر دوڑتا ہوا بہار کے خودرو پھول توڑ توڑ کر جمع کر رہا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں کناروں پر السی کے شوخ سرخ رنگ کے ننھے ننھے نازک پھول ہزاروں کی تعداد میں اُگے ہوئے تھے جن پہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ بیچ میں لالہ کے کئی بڑے بڑے سرخ پھول تھے جن میں کہیں کہیں بنفشی پھولوں کے چھینٹے بھی تھے۔ ایک جگہ جنگلی گلاب کا پودا تھا جس کا پھول توڑتے توڑتے کانٹا اس کے بیٹے کی اُنگلی میں چبھ گیا اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اُنگلی کو اس جگہ سے چوسنے لگا جہاں پر خون کا ننھا سا قطرہ اُبھر آیا تھا جس میں سورج چمک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کی انگلی کو دیکھا اور اسے خون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوس جانے کی ہدایت کر کے احتیاط سے گلاب کا پھول توڑا اور بچے کو دیا جو اس نے لے کر اپنے گدگدستے میں لگا لیا اور انگلی چوستے ہوئے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے اپنے دہنے ہاتھ کی انگلیاں ناک تک لے جا کر انہیں سونگھا، اس گلاب میں خوشبو نہیں تھی، جو دوسرے گلاب میں ہوتی ہے، اس نے سوچا۔ اسے اپنا باپ یاد آیا جو جب تک زندہ رہا اپنے شکار کے مہنگے شوق میں پیسے اُڑانے اور کوئی کام کاج نہ کرنے کی بنا پر کنبے بھر میں اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا رہا جس کی غیر ذمہ داری اور نکھٹوپن کی شکایتیں اس نے اپنی ماں تک سے سُنیں، جس کو عمر بھر صرف بھرپور طور پر زندگی گزارنے اور اس کے فلسفے پر غور کرنے کا شوق رہا، جس نے وہی کیا جو چاہا اور جو درست خیال کیا اور جو شاید تھا بھی عین درست ہی آخر کار — اس نے جنگلی گلاب کے پودے کے پاس کھڑے کھڑے دور آگے پگڈنڈی پر اپنے بیٹے کو دوڑ دوڑ کر خود رو پھول جمع کرتے ہوئے دیکھا اور اس نے سوچا: بیٹوں کو باپ کے شکرانے کے لیے اس کی دولت اور عزت اور اس کے رتبے اور شاید اس کے کارناموں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کو صرف اس خوشبو کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف ایک بار سچے گلاب کو چھونے سے ہاتھوں میں لگی رہ جاتی ہے اور جس کا آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا، مگر بعد میں جب انجانے طور پر ہاتھ کہیں سانس کے سامنے سے گزرتا ہے تو خوشبو کا احساس ہوتا ہے اور آدمی چونک کر سارے بدن پر اسے تلاش کرتا ہے اور پوروں تک پہنچ جاتا ہے اور انہیں سانس پر رکھ کر سونگھتا ہے اور اسے یاد آتا ہے کہ اس کے ماضی میں کہیں ایک گلاب کا پھول بھی تھا، اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

بچہ اس کو پیچھے پگڈنڈی پر رکے دیکھ کر ٹھہر گیا۔ "بابا!" اس نے آواز دی۔ وہ غیر ارادی طور پر دہنے ہاتھ کی انگلیوں کو ناک کے قریب لے گیا۔

"بابا۔" اس کے قریب آنے پر بچے نے پوچھا، "وہاں کیا کر رہے تھے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سوچ رہا تھا بیٹے۔"

"کیا سوچ رہے تھے؟" بچے نے شرارت سے سوال کیا اور بھاگ اُٹھا۔

دوڑ شروع کرنے سے پہلے اس نے حلق سے خوشی کی گہری گونج دار آواز پیدا کی جو کچھ کچھ بیل کے ڈکرانے سے مشابہ تھی۔ ابھی تیز، ابھی ہولے دوڑتے ہوئے انہوں نے کئی کھیت پار کیے۔ اس رستے پر گیہوں اور چنے کے کھیت تھے اور ایک کھیت میں چند بچے، کچے سبز چنوں کو آگ لگا کر اُن کی ہولیں بنا رہے تھے۔ کھیت کے کنارے کنارے بھاگتے ہوئے اسے ہولیں بنانے کی گرم گرم رس دار خوشبو آئی اور اس نے چند لحظے رک کر خوشی اور اُداسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ چنے کے جلتے ہوئے پودوں کو اور اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اور اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے پاؤں کے بل بیٹھے ہوئے مشتاق چہروں والے بچوں کو دیکھا۔ اس کا بیٹا بھی رک کر کمر پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر دوڑ پڑا۔ آگے خودرو پھولوں کی بہت سی کیاریاں اور کئی خالی اور تیار کھیت آئے اور بہار کی اٹھتی ہوئی ہوائیں ان کے چہروں کو چھوتی ہوئی گزرتی رہیں۔ آخر وہ کھیتوں کو چھوڑ کر سڑک پر آنکلے اور پاس پاس کھڑے ہو کر ہانپنے اور ہنسنے لگے۔ اس کے بیٹے نے کس کر دو تین مکے اس کی رانوں پر لگائے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

اب سورج ڈھل رہا تھا۔ سڑک تقریباً خالی تھی اور دھوپ میں گرم ہو کر چمک رہی تھی۔ صرف چند کسان اپنی عورتوں کے ہمراہ شہر سے خریداری کر کے لوٹ رہے تھے۔ مرد لاٹھیاں کندھوں پر رکھے اور ان سے گٹھڑیاں لٹکائے، اور عورتیں مٹی کی ہانڈیاں ایک کے اوپر ایک سروں پر رکھے، جو نیاں ہاتھوں میں پکڑے، سڑک کے کنارے کنارے پُل کی ڈھلان اُتر رہی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے کی گردن میں بازو ڈالا اور آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگا۔ پُل پر پہنچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر وہ رک گیا۔ سامنے اس کا شہر تھا جس پہ اب سورج چمک رہا تھا۔ اس نے ستانے کے انداز میں کمر پہ ہاتھ رکھے اور مڑ کر آخری بار دور دور تک سہ پہر کے چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ گیہوں اور چنے کا سبزہ اور السی کے پھولوں کا لالہ اور بے بُو خودرو پھولوں کا زردہ اور ہل چلی ہوئی زمین کی باداگی اور پھلدار درختوں کی سیاہی اور اوپر آسمان کا نیلم اور بہار کی بدلیوں کا براق ایک ایک کر کے اور پھر سب کے سب ایک ساتھ اس کی آنکھوں میں کھُب گئے اور اس نے ایک طویل لمحے تک اس دھڑ دھڑ دھڑکتی، سانس لیتی ہوئی عجیب و غریب سہ زمین کو دیکھا اور اسے اس شخص کا خیال آیا جسے ایک دفعہ اس نے دیکھا تھا، اس شخص کے چہرے پہ رنگ اور آنکھوں میں بے پناہ چمک عود کر آئی تھی اور وہ آخری دموں پہ تھا اور بڑا صحت مند اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھیں ڈھانپ لیں اور کئی لمحوں تک کھڑا اس منظر کو دل میں جذب کرتا رہا، پھر پلٹ کر پُل کو پار کرنے لگا۔

آج صبح سویرے وہ اس شہر میں موسمی پرندے کی مانند وارد ہوا تھا۔ علی الصبح جب بازار اور گلیاں ابھی خالی تھیں اور صرف فجر کی نماز سے لوٹنے یا صبح کی سیر کو جانے والے اکا دکا لوگ خاموشی سے کیکر کی دانتن چباتے ہوئے آجا رہے تھے اور ابھی دن کا اُجالا بھی نہیں پھیلا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے اور اپنا سوٹ کیس اُٹھائے اجنبیوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر آکھڑا ہوا تھا۔ میونسپلٹی کے بھنگی (ازلی طور پر جھکے جھکے) بازاروں میں جھاڑو دے رہے تھے اور گلیوں کی نالیاں صاف کر رہے تھے۔ ایک گوالا دودھ کے بڑے بڑے کمنڈل دونوں ہاتھوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں لٹکائے، ان کے بوجھ سے جھولتا ہوا تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ ایک فقیر بلند خوابیدہ آواز میں بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ اس نے سوٹ کیس آہستہ سے گھر کے دروازے کے آگے اینٹوں کے تھڑے پر رکھ دیا اور رک کر ان پرانی، مانوس آوازوں کو سننے لگا۔ بیس برس گزر گئے تھے مگر دن کی یہ ساری اولیں آوازیں وہی تھیں جن کو وہ اپنے لڑکپن میں فجر کے وقت (اپنے بستر میں کسمساتا ہوا) سن کر جاگا کرتا تھا — یا جاگ کر سنا کرتا تھا۔ دروازے کے آگے سر نیہوڑائے کھڑے کھڑے چند لمحوں کے لیے اس کے پاس نیم خوابیدگی کا وہ لذیذ اور غیر حقیقی عالم لوٹ آیا تھا جس میں سونے اور جاگنے اور سننے کے عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جو یہاں سے جانے کے بعد اس کو کسی خواب گاہ میں اور کسی بستر میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر دو انگلیوں سے ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ایک بار دو بار، تین بار — اس کا بیٹا حیرانی سے چاروں طرف محلے کے اُونچے اونچے مکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ دو سفید کبوتر کسی منڈیر سے اُڑ کر مدھم آسمان پر سے گزرے۔ کسی نے اوپر کی منزل کی کھڑکی کھولی۔

"کون ہے؟" ایک لڑکی نے کھڑکی سے سر نکال کر سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں۔" وہ سر اُٹھا کر احمقوں کی طرح بولا۔

لڑکی کا چہرہ غائب ہو گیا اور کھڑکی کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر زینے پر قدموں کے اُترنے کی آواز اُبھری۔ پھر دروازہ کھلا۔

"ماموں جان۔" لڑکی نے سانس روک کر زیرِ لب کہا۔

اس نے متلاشی نظروں سے اس لمبے قد اور چھریرے بدن کی نوجوان لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار شعوری طور پر اسے اتنی عمر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے گزر جانے کا احساس ہوا۔ اس نے سوٹ کیس اٹھا کر ڈیوڑھی میں رکھا اور اس اجنبی لڑکی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اوپر کی منزل پر ایک دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی مدھم سی آواز آئی۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ پتھر کے زینے اور دیواروں کے لاوقت رنگ و روغن کو دیکھ کر آناً فاناً وہ بیس برس کو جیسے ایک جست میں پھلانگ کر اپنے لڑکپن میں جا کھڑا ہوا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ، قدم قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کو اجنبیت اور مانوسیت کا وہ عجیب و غریب ملا جلا احساس ہوا جو لمبی جلاوطنی کے بعد گھر آنے والوں کا ہوتا ہے اور جو صرف کان اور آنکھ ہی میں نہیں، بدن کی ساری جلد پر اور اس کے نیچے لہو کی سرسراہٹ تک میں محسوس کیا جاتا ہے اور جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وقت یکسر گم ہو جاتا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا زینے کے اوپر اس کی بہن چوکھٹ کا سہارا لیے اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کا سر آدھے سے زیادہ سفید ہو چکا تھا اور اس کے چہرے کی جلد ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی پھیلی ہوئی آنکھوں میں وہ خلاء تھا جو دکھی عورتوں کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوسری سیڑھی پر رکا دن کے بڑھتے ہوئے اجالے میں چپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے صرف پانچ سال بڑی تھی اور اس کو وہ لمبے قد اور چھریرے بدن کی چلبلاتی ہوئی جوان لڑکی کے روپ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس وقت دوسری بار اسے عمر کے گزرنے کا دھچکا لگا۔

پھر اس کی بہن کی کانپتی ہوئی کمزور آواز آئی: "سعید ــــ" اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ ہلا اور آخری دو سیڑھیوں کو پھلانگ کر اس کے قریب پہنچا اور ڈھیلے لباس میں ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو محسوس کر کے اس کا دل جیسے لہو سے بالکل نچڑ گیا اور وہ بچوں کی طرح اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اسے صرف اتنا پتا چلا کہ وہ خستہ ہڈیوں کے ہلکے پھلکے، ہچکیاں لیتے اور ہچکولے کھاتے ہوئے ناطاقت بدن کو اپنے جسم کے ساتھ تھامے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑا ہے اور اس خوش بُو کو سونگھ رہا ہے جو فجر کی سوتی جاگتی آوازوں کی طرح پرانی اور لذیذ اور مانوس ہے اور جو صرف دودھ پیتے بچوں یا اپنی بہنوں سے آتی ہے جن کے ساتھ آپ بچپن میں سوئے اور لڑکپن میں کھیلے ہوں۔ ایک بار جب اس نے سر اٹھا کر بے مدعا سامنے دیکھا تو اسے صرف اتنا پتا چلا کہ چھریرے بدن کی لڑکی اور اس کا بڈیا ساتھ ساتھ کھڑے آنکھیں پھیلائے پریشانی سے ان دونوں کو دیکھ رہے ہیں اور صحن کے کونے سے جو آسمان کا ٹکڑا نظر آ رہا ہے اس پر دو سنہری کبوتر خوشی سے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ اس طرح اس کو جاننے کی خواہش کیے بغیر پتا چلا کہ سورج نکل آیا ہے اور دل گیلا کپڑا ہے جو بل دے کر نچوڑا جا رہا ہے۔ دراصل اسے کچھ بھی پتا نہ چلا تھا، کہ ایک ہی رنگ و بُو کے دو جلاوطن بدنوں میں وقت یکسر گم ہو چکا تھا۔

پھر بعد میں وہ بڑے کمرے میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا اور اس کی بہن اس کے سامنے بیٹھی اس کے بچے کو گود میں لیے باتیں کر رہی تھی: "تمہارا خط مل گیا تھا ــــ" وہ کہہ رہی تھی اور وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا ہوا کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے کے سارے سامان میں سے صرف ایک وہ کونے میں کھڑی ہوئی اخروٹ کی لکڑی کی بھاری الماری تھی جس سے وہ واقف تھا۔ باقی سب بدل چکا تھا۔ وہ دن اسے آج بھی یاد تھا جس روز یہ الماری ان کے گھر میں وارد ہوئی تھی اور اوپر کی منزل تک پہنچتے پہنچتے تنگ زینے میں پھنس کر رہ گئی تھی اور زینے کے اوپر اس کا باپ کھڑا پسینے میں شرابور آٹھ نو رنگاتے ہوئے مزدوروں کو یوں تن دہی سے ہدایات دے رہا تھا جیسے میدان جنگ میں شاید کوئی جرنیل! اس روز وہ سکول سے ذرا دیر سے لوٹا تھا اور جلد از جلد اوپر پہنچنا چاہتا تھا کہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی مگر آدھے زینے میں یہ بہت بڑی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھاری سی الماری پھنسی پڑی تھی جو نہ اوپر جاتی تھی نہ نیچے اور نہ ہی گزرنے کا کوئی راستہ دیتی تھی کسی کو، اور آٹھ پہاڑیے، جن کے پسینے میں بھیگے ہوئے چیتھڑے لٹک رہے تھے اور پھڑکتے ہوئے گیلے پٹھے نیم اندھیرے میں چمک رہے تھے اور جن کے جسموں سے محنت اور غربت کی تیز لبساند آ رہی تھی، چار الماری کے آگے اور چار پیچھے اپنے حماقت زدہ چہرے لیے بوکھلائے کھڑے تھے اور اس کے باپ کی غصیلی، کڑک دار آواز پر جھک جھک کر غیر یقینی ہاتھوں سے الماری کو ٹٹول رہے تھے — وہ آہستہ سے مسکرایا — اس الماری کے دروازوں کی وارنش شدہ سطح پر اخروٹ کی لکڑی کی ٹیڑھی میڑھی سیاہ دھاریاں اوپر سے نیچے تک چلتی تھیں، اور اس کے اندر سالہا سال تک کھیس اور دریاں اور چادریں اور پتلی پتلی دلائیاں اور نیچے کے خانے میں پلنگ کے روغنی پائے (اور ایک پرانا اور ٹوٹا ہوا بینجو) رکھے جاتے رہے تھے اور جب اسے کھولتے تھے تو اندر سے اخروٹ کی لکڑی اور کچے سوت کی ملی جلی تیز بو آیا کرتی تھی جو باہر کی کسی بو سے میل نہ کھاتی تھی۔ چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر جائے اور الماری کا دروازہ کھول کر دیکھے کہ اب اس میں کیا رکھا جاتا تھا اور اس کی بو اب بھلا کیسی تھی؟

"تم اپنی بیوی کو نہیں لائے —؟" اس کی بہن کہہ رہی تھی اور وہ جواب میں پتا نہیں کیا کہے جا رہا تھا، کیونکہ اس کی عمر ساری ناک اور کان اور آنکھ بن سمٹ کر آ گئی تھی اور وہ نظروں سے اس لمبی اور چھریری لڑکی کا تعاقب کر رہا تھا جو اس کی بہن کا پہلا روپ تھا جو اس کمرے میں، جو سالہا سال تک اس کا کمرہ رہا تھا، آ جا رہی تھی اور جھکی ہوئی، اجنبی اور مانوس نظروں سے اسے اور اس کے بیٹے کو تاک رہی تھی۔ اس کے کمرے کی ایک دیوار لکڑی کی تھی جو غسل خانے کو الگ کرتی تھی اور جس پر ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مارو تو ساری لرزتی تھی۔ دوسری دیوار میں شیشے کی الماری جڑی تھی جس میں آدمی پورے قد سے کھڑا دکھائی دیتا تھا اور اسے کھولو تو اندر قرآن مجید پڑا ہوتا تھا اور نچلے خانے میں پتا نہیں کس کی ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح پڑی رہتی تھی۔ گلی والی دیوار میں دو کھڑکیاں کھلتی تھیں جن میں جالی لگی ہوئی تھی اور جن کے رستے فجر کی دھندلی خوابیدہ آوازیں آیا کرتی تھیں اور — ایک بار بہت فجر کو سامنے والے گھر میں مہمان اُترے تھے اور ان کا لونڈا خوشی کے مارے گلی میں سے گاتا ہوا گزرا تھا: "دل والے —" اور اس نے اپنے بستر میں سوتے سوتے تقریباً خواب میں یہ آواز سُنی تھی اور آہستہ آہستہ جاگ پڑا تھا اور اس سُر کو بار بار دل میں دہرا رہا تھا حتیٰ کہ اس آواز کا ایک بدن بن گیا تھا اور ایک رنگ نکل آیا تھا جو پیلا تھا اور ایک عمر کے گزرنے پر بھی پیلا ہی رہا تھا اور یوں اسے پتا چلا تھا کہ ماضی کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ناشتے کی طشتری اُلٹ دے اور بھاگ کر جائے اور اپنے کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھے کہ اب وہ بھلا کیسا تھا اور اس میں کیا کچھ رکھا تھا۔

"تیرے سر میں سودا، تھا سعید۔" اس کی بہن تاسف سے کہہ رہی تھی، "تو اپنے بابا پہ گیا ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آتش دان پر اس کے ماں باپ کی بڑی بڑی تصویریں رکھی تھیں جن کے چہروں پہ لازوال مسکراہٹیں تھیں اور جو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی بہن کا شوہر، جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہ تھا، آئندہ بھی کبھی دکھائی نہ دے گا چنانچہ اب وہ اس سے کیا کہہ سکتا تھا بھلا۔ اس نے جمائی لی اور چپکے سے جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ جوتے اتارے بغیر گہری نیند سو گیا۔

جب وہ سو کر اٹھا تو اس کے جوتے اُترے ہوئے، ترتیب سے پلنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے آگے رکھے تھے اور کمرے کے سارے دروازے بند تھے اور باہر صحن میں اور باورچی خانے میں اس کی بہن اور بھانجی اور کام کرنے والی عورت سب دبے پاؤں چل پھر رہے تھے اور اس کا بیٹا کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اس نے اپنی بہن سے دو گھنٹے کی اجازت لی اور باہر نکل آیا۔ بازار تک آتے آتے اسے چار آدمی ملے جنہوں نے دونوں باپ بیٹوں کو غور سے اوپر نیچے دیکھا اور خاموشی سے گزر گئے۔ بازار میں داخل ہونے سے پہلے اسے شدید حجاب آلود اجنبیت کا احساس ہوا اور اس نے فیلٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا اور کوٹ کا کالر اٹھا لیا اور جیبوں میں ہاتھ دیے دیے بازار اور سارے شہر میں سے گویا سلیمانی ٹوپی پہنے پہنے گزر گیا۔ کسی نے اسے نہ پہچانا تھا اور اس سے اسے عجیب سے رنج مگر عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی، دوبارہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے، اس نے فیلٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا، کوٹ کا کالر اٹھایا اور ہاتھ جیبوں میں ٹھونس کر پل سے اترنے لگا۔

اسی طرح اپنے فیلٹ اور کوٹ کی آڑ میں اس نے گول سڑک کے کنارے کنارے آدھے شہر کا چکر کاٹا اور بازار میں داخل ہوا۔ سڑک پر گھوڑوں اور موٹر گاڑیوں کی گرد اڑ اڑ کر اس کے ہیٹ اور کوٹ کے بازوؤں پر جم گئی تھی اور اس روز کی آخری دھوپ میں ذرہ ذرہ چمک رہی تھی۔ سورج کے گرد بادل جمع ہو رہے تھے۔ بازار میں اس نے رحیم شربت والے کو پہچانا جس نے داڑھی رکھ لی تھی اور داڑھی سفید تھی۔ وہ اپنے پرانے مستقل انداز میں گدی پہ بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں پنکھی تھی جس سے وہ اپنے آگے پڑی ہوئی رنگ برنگے دیسی شربتوں کی بوتلوں پر بھنبھناتی